بھگا دیا۔ بہر کیف جو بھی معاملہ تھا میرے لیے اچنبھے کی بات نہ تھی۔ میں اب تک امریکیوں کے سیلانی پن کو کچھ نہ کچھ
تھی۔ وہ اپنے لیے سفر کو وسیلہ ظفر بنانے میں بڑی تگ و دو کرتے تھے۔ ایک مدت کام کی روٹین سے وابستہ رہتے
جوڑتے رہتے اور پھر اس رقم سے بریک پر چلے جاتے۔

امریکن تو اس چھٹکارے کو توانائیاں اکٹھی کرنے اور نئے تجربے سیکھنے کو ''بریک'' کا نام دیتے تھے لیکن
چاہتی تھی کہ اسے اسلامی نقطہ نظر سے بھی سمجھا جائے اور مہمان بھی اس سفر میں سیکھنے کے عمل کو اپنے لیے وسیلہ ظفر جانے
میرے لیے اس جوڑے کو رکھنا آسان تھا لیکن کچھ دنوں کے بعد میرے لیے ایک مشکل پیدا ہوگئی۔

مجھے پتہ چلا کہ اینڈریوز لندن کے کسی کالج میں انگریزی کا پروفیسر ہے اور جوئی پوری ڈاکٹر ہے اور ڈاکٹر
ہونے کے ناتے اُس کی جان کاری بہت ہے لیکن وہ ڈاکٹری کی پریکٹس نہیں کرتی۔

پروفیسر اینڈریوز اور ڈاکٹر جوئی دونوں میاں بیوی نہیں تھے اور اکٹھے رہنے کا پلان بنا چکے تھے۔ میرے
چوری چھپے کی آشنائی تھی جس کی میرے دین میں کوئی اجازت نہ تھی۔ اُن کے لیے یہ معمول کا فعل تھا کہ جب تک
کر ایک دوسرے کی طبیعت کو جان نہ لیا جائے تب ہمسفری قبول نہیں کرنی چاہیے اور شادی کا طوق اپنے گلے میں
چاہیے۔

جوئی کا والد ایک بڑا مشہور و معروف ڈاکٹر تھا اور لندن میں ایک سنٹرل ہسپتال میں بڑی اہم پوسٹ
تھا۔ میں حیران تھی کہ اُس نے بغیر نکاح کے جوئی کو انگلش کے پروفیسر کے ساتھ کیسے جانے دیا۔ لیکن تب مجھے
وہاں ''آزادی'' کی خاطر انسان ہر قسم کی قربانی دے سکتا ہے اور والدین اپنی آزادی اس طرح خریدتے ہیں
آزاد کر دیتے ہیں۔

بہر کیف یہ تجربہ میرے لیے نیا تھا۔ اب میڈیا کی بدولت مشرقی معاشروں میں بھی شادی سے پہلے
together کچھ ایسے اچنبھے کی بات نہیں لیکن آج سے قریباً تیس برس پہلے ایسی بات سن کر منہ کھلے کا کھلا رہ جاتا
یہ دونوں اپنے میں مگن رہتے۔ بہت کم آمیز تھے۔ باپ کی طرح مناظرے اور بحثوں میں شریک
دن کے وقت جوئی اپنے کمرے کا دروازہ اندر سے مقفل رکھتی۔ اینڈریوز شلوار قمیض پہن کر سر پر نمازیوں والی ٹوپی
چسپت ہو جاتا۔ ایک روز جب وہ باہر جا رہا تھا میں آک کے درخت تلے کھڑی بجلی کا بل دیکھنے میں مشغول تھی۔

ایک روز اینڈریوز باہر نکلا تو ہم دونوں ایسے ہی سرسری علیک سلیک کرنے لگے۔

''تم کہاں جا رہے ہو اینڈریوز؟'' اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔

''بھائی! وہ تم جوئی کو پیچھے چھوڑ جاتے ہو۔ وہ کمرے سے نہیں نکلتی۔ لنچ کے لیے بھی نہیں۔''

''وہ اُس کی مرضی ہے آپا جی..... وہ grown up ہے۔ اپنے آپ کو Look after کر سکتی ہے
کریں۔''

''تم چاہو تو میں تمہیں کوئی سینڈوچ بنا دیا کروں؟'' میں نے بڑی دریا دلی سے کہا۔ اس جملے کے ساتھ
اپنی برتری کا احساس ہوا۔

''نہیں بانو آپا! مجھے کھانے پینے کی کوئی دقت نہیں۔ میں روز کشمیری بابا کے پاس جاتا ہوں۔ وہ میری تربیت بھی کرتے ہیں اور مجھے لنگر بھی کھلا دیتے ہیں۔''

میں نے داتا گنج بخش کا نام تو سنا تھا لیکن کشمیری بابا کا نام کبھی نہیں سنا تھا۔

اینڈریوز نے مجھے بتایا کہ کشمیری بابا نکلسن روڈ کے آخری کونے پر رہتے ہیں۔ وہ زیادہ وقت ذکر فکر میں مشغول رہتے ہیں اور لوگ اُن سے اپنی مشکلات کے حل کے لیے آتے جاتے ہیں۔ کچھ لوگ اینڈریوز کی طرح راہ سلوک' عرفان حق الیقین حاصل کرنے کی تربیت بھی حاصل کرتے ہیں۔

کچھ مہینے ایسے ہی گزر گئے۔ ان کے دوران خاں صاحب کو جوئی کے والد نے چند خط شکریے کے لکھے جن میں محبت کا اظہار تو ضرور تھا لیکن اُس کے انتخاب پر کوئی اعتراض نہ ہوتا۔

پھر اچانک دونوں نے غالباً اکتوبر میں واپس لندن جانے کی ٹھانی۔ جس سہولت سے وہ ہمارے گھر کا فرد بنے تھے اسی آسانی سے وہ اچانک صرف خاں صاحب سے مل کر ایئرپورٹ روانہ ہو گئے۔ لندن پہنچ کر ایک دو خط اینڈریوز نے لکھے لیکن نہ یہ معلوم ہو سکا کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ اس بات کا پتہ بھی نہ چلا کہ وہ دونوں اکٹھے بھی ہیں کہ نہیں۔

پھر اچانک کرسمس سے کچھ دیر پہلے اینڈریوز اور جوئی بغیر اطلاع دیے ٹیکسی میں سوار گھر آ گئے۔

میں اُن کے آنے پر بڑی خوش ہوئی۔ سفید رنگت مجھے ہمیشہ مرعوب کرتی رہی ہے اور مجھے اندر ہی اندر محسوس ہوتا ہے جیسے اُن کی اس خوبی کے آگے ہر قسم کی روشنی ماند پڑ جاتی ہے۔ ان دونوں میں کرسمس کے قریب تھوڑا سا جوش و خروش آ گیا۔ اینڈریوز میرے پاس آیا اور کہنے لگا..... ''بانو آپا! آپ کے چولہے میں بڑا اچھا oven ہے۔ کیا میں اور جوئی کرسمس کیک بنا سکتے ہیں؟''

''شوق سے مجھے صرف سودے بتا دو..... میں منگوا دوں گی۔''

''جی نہیں سودے میں خود لاؤں گا۔ آپ کو کچھ منگوانا نہیں ہے..... صرف اجازت دینا ہے۔''

''دوپہر کے وقت جب جیونی بہن باورچی خانہ چھوڑ دیتی ہے ہم کیک بنا لیں گے۔''

وہ سودے خود لا رہے تھے۔ اس چیز نے مجھے اطمینان کا سانس لینے پر مجبور کیا..... یہ کمینگی ضرور تھی لیکن میں ڈرتی تھی کہ نہ جانے وہ کیا کچھ منگوا بیٹھیں اور اس پر کتنی لاگت آ جائے۔

کرسمس کی پچیس تاریخ سے چند دن پہلے اُنہوں نے قریباً چھ پونڈ کا براؤنی شکل و صورت کا کیک تیار کر لیا۔ اس میں کرنٹ اور میوے ڈالے اور اس کے اُوپر کرنچ کرنچ کرنے والی چینی کی پھلکیاں سی سجائی گئی تھیں۔ جوئی نے آدھا کیک لے کر اپنے والدین کو تیز رفتار ڈاک سے روانہ کر دیا۔ باقی کیک اُس نے اپنے کمرے میں رکھ لیا۔

پچیس دسمبر کو بچوں نے قائداعظم کی سالگرہ کے سلسلے میں کوٹھے پر موم بتیاں جلائیں۔ بڑا سا سبز جھنڈا جس پر چاند تارا بنا تھا لہرایا۔ غالباً اُن دونوں نے یہ سمجھا کہ ہم کرسمس کی خوشیوں میں شامل ہو رہے ہیں۔ رات کو وہ دونوں بارہ بجے کے قریب کھانے کے کمرے میں آئے۔ بچوں کو چپکے سے بلایا۔ کیک پر موم بتیاں لگائیں۔ کچھ حمد و ثنا (Carolls) گائے۔ کیک کاٹا کھایا اور سو گئے۔

ہمیں اُنہوں نے جگانے یا شریک ہونے کی زحمت نہ دی۔ صبح تھوڑا سا کیک مع چند موم بتیوں کے کا[illegible] پڑا تھا۔ ہم نے اسے بڑے ذوق و شوق کے ساتھ کھایا اور معترف ہوئے کہ واقعی اس رنگت اور مزے کا کیک [illegible] نہیں ملتا۔ لیکن ہمیں خدا نے یہ توفیق نہ دی کہ اس بات کا ذکر اُن دونوں سے کرتے۔

اب یہ بات پایۂ تصدیق کو پہنچ چکی تھی کہ وہ دونوں عیسائی تھے اور اپنے مسلک پر استقامت سے گامزن [illegible] شادی شدہ نہ تھے۔

لیکن جلد باز انسان کے بے احمق پن کی دلیل ہے کہ کافی شواہد اور ڈیٹا جمع کیے بغیر کچھ معاملات پر حتمی فیصلہ دیتا ہے۔ یہی ہمارے ساتھ ہوا۔

ایک روز اینڈریوز اپنے ساتھ تھوڑی سی مٹھائی لے کر گھر آیا۔ ہم دونوں برآمدے میں بیٹھے تھے اور اپنے [illegible] کا تیا پانچہ کرنے میں مشغول تھے۔

''یہ مٹھائی آپ کے لیے ہے۔''

''کس خوشی میں اینڈریوز؟'' خاں صاحب نے پوچھا۔

''میں آج کشمیری بابا کی مہربانی سے مسلمان ہو گیا ہوں۔ اب میرا نام اینڈریوز سلیمان ہے..... آپ [illegible] صرف سلیمان پکار سکتے ہیں۔''

پھر وہ پہلی بار شفو جی سے بغلگیر ہوا۔ بچے اور اُن کے دوست اس خبر کو پا کر بہت خوش تھے۔ اب مجھے [illegible] دیتے ہوئے بھی کچھ ایسی خوشی نہ ہو رہی تھی کیونکہ میرا خیال تھا کہ شاید ملت کے لیے یہ کوئی گرانمایہ اضافہ نہیں [illegible] نے سب میں مٹھائی تقسیم کی۔ اینڈریوز کو مبارک دی اور رات کے وقت پلاؤ پکانے کا ارادہ کیا۔

میرے دل میں کھد بد ہو رہی تھی۔ میں اُسے اخلاقیات اور خاص کر اسلامی اخلاقیات پر کچھ لیکچر دیتا [illegible] لیکن چونکہ میرا علم کم اور ناقص تھا اس لیے چپ رہی۔

چند دن بعد اینڈریوز اور جوئی سامان باندھے برآمدے میں موجود تھے۔ وہ واپس جانے کے لیے [illegible] تھے۔

''اینڈریوز کہاں؟''

''گھر..... لندن۔''

''لیکن میں تو تمہارے اعزاز میں ایک دعوت کرنے والا ہوں۔ مفتی جی کو بھی اطلاع دے دی ہے۔''

''مشکل یہ ہے خاں صاحب کہ جوئی اب یہاں رہنا نہیں چاہتی۔''

''پر کیوں؟''

''وہ عیسائی ہے اور میں مسلمان..... ہماری شادی نہیں ہو سکتی۔ وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہے۔''

''بھائی اسلام میں صاحب کتاب کے ساتھ شادی جائز ہے۔ وہ کیوں گھبرا رہی ہے؟''

''یہ تو اسلامی فراخدلی ہے خاں صاحب! وہ عیسائی ہے اور وہ مسلمان سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔ اُسے [illegible]

والے اچھے نہیں لگتے..... فیصلہ اس کا ہے۔"

کچھ ہی دن بعد کا ذکر ہے کہ میرے کمرے میں کھلنے والے غسلخانے اور ڈریسنگ روم سے ملحق باکس روم کا تالا بند ہو گیا۔ میں نے چابی اندر چھوڑ دی اور کڑک کر کے دروازہ کھینچ کر اندر سے تالا بند کر دیا تھا۔

چابیاں اندر چھوڑ کر دروازہ بند کرنے کا یہ پہلا واقعہ تھا۔ اس کے بعد یہ غلطی میں نے کئی بار کی لیکن اُس روز تالا تھا۔ میں پریشان ہو گئی۔ پہلے تو بڑی دیر مختلف چابیاں لگا کر تالا کھولنے کی مہم جاری تھی کہ دروازے پر دستک صاحب کی عدم موجودگی میں اینڈریوز کبھی میرے کمرے میں نہ آیا تھا۔ اُسے دیکھ کر میں حیران ہوئی۔

"کیوں سلیمان..... کیا میں کچھ کر سکتی ہوں؟"

"میں نے سنا ہے کہ آپ کا تالا بند ہو گیا ہے اور اس کی چابی نہیں ملتی۔"

"ہاں..... ٹھیک سنا ہے تم نے۔"

"میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں۔"

میں نے جھنجھلا کر کہا..... "او بھائی! تم کیا مدد کرو گے۔ چابی تو اس کی اندر رہ گئی ہے۔"

اینڈریوز نے اپنے کُرتے کی جیب سے چابیوں کا ایک گچھا نکالا۔ اس میں ایک نہیرنے کی شکل کی چابی نما چیز

"میں دو سال چور رہا ہوں۔ ہر قسم کا تالا کھول لیتا ہوں۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں کوشش کر سکتا ہوں۔"

میرا جی تو اُس کی مدد لینے کو نہ چاہتا تھا لیکن میں نے حامی بھر لی۔ چند ہی لمحوں بعد دروازہ کھل گیا۔ میں نے ان سے اُس کا شکریہ ادا کیا اور نئی اُلجھن کو سینے بیٹھ گئی۔

یہ نومسلم اینڈریوز کون تھا؟

بغیر شادی کے کاسنی کمرے میں جوئی کے ساتھ رہنے والے کی اصلی شناخت کیا تھی؟ سر پر دو تہوں کی پگڑی پہن بابا کی درگاہ پر روز جانے والا یہ شخص اچھا تھا کہ برا؟ میں اُسے کس خانے میں ڈالوں؟ مسلمان ہو جانے والا کیا تھا۔

اس سوچ کا ذکر خاں صاحب سے بالکل نہ کیا کیونکہ وہ عموماً کہا کرتے تھے ہمیشہ دماغ ہی استعمال نہ کیا کرو کبھی دل کو اس کی قید سے رہا بھی کر دیا کرو.....

یہ وہ دور تھا جب خاں صاحب کے چھوٹے بھائی اشتیاق احمد کا ہمارے ہاں خوب آنا جانا تھا۔ تقو کے صائل بھی میرے بچوں کے دوست تھے۔ اس کی بیوی منزہ کبھی اس کے ساتھ آ جاتی، کبھی صبح کے وقت اکیلی ملنے عموماً اپنی تمام تر خوش دلی انسان دوستی کے ساتھ کچھ پکا کر سجا کر لے آتی۔ باورچی خانہ اُس کے کھلے دل کی وجہ سے ہو جاتا۔ وہ گلاب جامن بناتی، کیک بیک کرنے کے طریقے سمجھاتی، کڑھائی گوشت بنانے کی ترکیب سمجھاتی، وہ سب کو اپنی چھوٹی انگلی کے ساتھ لپیٹنے کا فن بھی جانتی تھی۔

خاں صاحب کا رابطہ خلق سے اور طرح کا تھا۔ منزہ اور طرح سے جال پھینکتی تھی۔ خاں صاحب جانتے تھے کہ

جب انسان میں زیادہ خوبیاں اکٹھی ہو جائیں تو خطرے کی گھنٹی کہیں نہ کہیں بجتی ہے۔ دولت، حسن، دانشوری یہ سب دین تو ضرور ہے لیکن اسی دین کے باعث اللہ آزماتا بھی خوب ہے۔ وہ یہ دیکھتا ہے کہ نعمتیں جھولی میں ڈالنے والا شاکر پر ہے کہ نہیں۔ جہاں غریبی، بدشکلی، کم عملی کا ساتھ ہو وہاں بھی آزمائش ہی مطلوب ہوا کرتی ہے۔ اللہ جانچتا ہے کہ شاکر کے مقام پر یہ شخص صابر ہے کہ نہیں۔ ہمارے عہد میں غریبی کا امتحان قدرے آسان تھا۔ ابھی غریب آدمی میں ہوس اور حرص ایسے مہلک مرض نہ بنے تھے۔ امیری بھی نمائش، زیبائش، آرائش کی عادی نہ تھی۔ سوسائٹی کی آزمائشیں کم تھیں۔

ہنس مکھ منزہ جسے ہم شرمیلا ٹیگور کہا کرتے تھے، باریک بین، دُور اندیش، پہلے تول پھر بول والی خاتون شاید چاہتی کر لیتی، جسے چاہتی اپنا بنا لیتی..... غیبت پر آئے غیبت کر لی، تعریف کو دل چاہا سراہنے پر آمادہ ہو گئے تو آسمان کے قلابے ملا دیئے۔ نہ اپنے اعمال پر نازاں نہ احساسِ جرم میں مبتلا۔ بہت جلد اُس کی اینڈریوز اور جوئی سے دوستی ہو گئی۔ وہ آتے ہی دھڑلے سے ان کی طالب ہوتی۔ وہ بھی گویا منزہ ہی کے منتظر ہوتے۔ پھر محفل جمتی، خوش گپیاں ہوتیں، پکوڑے کا دور ہوتا..... گھنٹے پریوں کی طرح داستان سرائے کے اُوپر سے اُڑ جاتے۔

ایک روز بڑا متفکر چہرہ لیے منزہ میرے کمرے میں آئی۔ کچھ دیر وہ سوچتی رہی پھر بولی..... ''پتہ نہیں کیا کہنا چاہئے کہ نہیں..... لیکن آپ کو پتہ ہے میں آپ کو کچھ بتائے بغیر بھی نہیں رہ سکتی۔''

''کیا ہوا؟''

''یہ جو اینڈریوز ہے ناں.....''

''ہاں..... ہمارا اینڈریوز۔''

''بالکل! اور یہ جو جوئی ہے ناں۔''

''ہماری جوئی؟'' میں نے سوال کیا۔

''یہ دونوں شادی شدہ نہیں ہیں۔''

''اچھا پھر؟..... اب کیا کرنا ہے؟'' میں نے تشویش سے پوچھا۔

''کرنا..... کرانا کیا ہے؟ یہ مغربی لوگ ایسے ہی ہیں۔ یہ Living together کو برا نہیں سمجھتے۔ تجرباتی طور پر ساتھ رکھتے ہیں۔ پھر اگر نبھ جائے تو شادی ورنہ.....''

پہلی بار میں نے گھبرا کر کہا ''لیکن..... اگر بچوں کو پتہ چل گیا..... دیکھ لو ناں..... ثوبیہ، توصیف، یا تمہارے بچے..... کبھی کبھی تو ڈیڈی جی کے بچے عدنان، لبنیٰ اور عائشہ بھی آ جاتے ہیں۔ ان لوگوں کے تو کچے ذہنوں پر کیا اثر پڑے گا..... پھر اسلام میں تو ویسے بھی چوری چھپے کی آشنائی نہیں کر سکتے..... منع ہے۔''

''تو یہ کون سا مسلمان ہیں کا کی..... تم پریشان مت ہو جانا۔ تمہاری عادت ہے۔ دوسروں کے مسئلے اپنے سر پر مت اُٹھا لینا۔ ان کی اپنی اخلاقی قدریں ہیں۔ یہ سیکولر لوگ ہیں۔ یہ ہماری طرح اولڈ فیشنڈ نہیں ہیں۔''

میں نے سیکولر کا لفظ پہلی بار یوں استعمال ہوتے سنا۔ ابھی میں اس لفظ کے استعمال، معنی اور بھرم سے آشنا نہ ہوئی۔

ایک روز ہم بابا جی کے ڈیرے سے لوٹے تو بچے گراؤنڈ میں کرکٹ کھیل رہے تھے۔ ان کو چھوڑ کر

ے میں پہنچے۔ برآمدے میں منزہ اپنے گدگدے ہاتھوں کے اشاروں سے جوئی اور اینڈریوز کو کچھ سمجھانے میں تھی۔ ہم دونوں ٹیموں کو چھوڑ کر اپنے کمرے میں آ گئے۔ ابھی ہمیں زیادہ وقت نہ گزرا تھا کہ منزہ نے دروازہ کھٹکھٹایا ''بیلوں شقو بھائی!''

''آیئے آیئے۔''

منزہ کا چہرہ خوشی سے تمتمایا ہوا تھا اور وہ کلکاریاں مارتے بچے کی طرح معصوم لگ رہی تھی۔

''شقو بھائی! سلیمان چاہتا ہے کہ وہ جوئی سے شادی کر لے۔ مسلمان ہونے کے بعد وہ اس طرح نہیں رہنا چاہتا۔''

''بڑی خوشی کی بات ہے..... لیکن جوئی تو مسلمان نہیں ہوئی۔'' میں نے خدشہ ظاہر کیا۔

''اہل کتاب سے نکاح جائز ہے۔ میں نے جوئی کو سمجھا دیا ہے۔ اسے مسلمان نہیں ہونا پڑے گا۔ تیاری پکڑو ہم نے بڑا کرم کر دیا' بڑی خیر ہو گئی پت.....'' یہ کہتے ہوئے خاں صاحب باہر اینڈریوز اور جوئی کے پاس چلے گئے منزہ کے پاس بیٹھ کر نکاح سے متعلقہ تیاریوں میں مگن ہو گئی۔

یہ منزہ کا ڈیپارٹمنٹ تھا۔

اس نے جوئی کو سجانے کے لیے زیور سے لے کر بانٹنے والی بدکی تیاری تک' ڈھولکی بجانے والیوں کو بلانے سے میلہ منانے تک چھوٹی چھوٹی تفاصیل کے ہمراہ ایک ہنگامہ خیز شادی کا اہتمام کر لیا۔ گھر میں ہر وقت بنرا بنری کی گونجنے لگیں' ڈھولک کی تھاپ سارے محلے میں خوشیاں بکھیرنے لگی۔ ہر وقت آنے جانے والیوں کا تانتا چل نکلا۔

اینڈریوز ایک روز باورچی خانے میں میرے پاس آیا۔ کہنے لگا..... ''بانو آپا! میں ایک کیک بنانا چاہتا ہوں۔''

''کیک؟ کیسا کیک؟''

''وہ ہمارے ہاں رواج ہے کہ شادی کے کیک کے بغیر شادی مکمل نہیں ہوتی۔ Wedding کیک میں بناؤں گا آپ اجازت دیں گی۔'' اس نے باورچی خانے کے اوون کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیوں نہیں کیوں نہیں..... کیا کچھ درکار ہو گا؟''

''باقی سب کچھ میں لے آؤں گا۔ گھر پر کیا براؤن چینی ہو گی۔''

''ہاں شکر مل جائے گی۔''

''بہت اچھا۔''

منزہ نے ایک مولوی صاحب بلا کر نکاح تک پڑھوا دیا۔ عموماً بعد میں اصل بھید کھلا۔ نکاح میں مردوں کے علاوہ شریک نہ ہوا لیکن بعد ازاں کیک کاٹنے کی رسم تمام تر عورتوں کے حوالے ہو گئی۔ کوئی دس پونڈ کا کیک موم بتیوں سے سجا کھانے کے کمرے کی سیاہ میز پر پڑا تھا۔ جوئی اور اینڈریوز نے اسے کاٹا اور بانٹا۔ پھر قریباً ایک چوتھائی کیک اینڈریوز کمرے میں لے کر جانے لگا تو میں نے پوچھا ''اسے کیا کرو گے سلیمان؟''

''یہ میں ڈاکٹر گیون کے گھر بھیجوں گا۔ وہ بہت خوش ہوں گے..... ہم نے کرسمس پر بھی انہیں کیک بھیجا تھا۔''

ابھی سلیمان اور جوئی کی شادی کو زیادہ دن نہیں ہوئے تھے کہ پتہ لگا وہ دونوں ہنی مون منانے لندن جا رہے

ہیں۔ خاں صاحب اُن کے ساتھ کچھ وقت گزارتے۔ اشتیاق منزہ بھی آ جاتے تو باتوں میں گرما گرمی پیدا ہو جاتی۔ لیکن میرے دل پر کوئی بوجھ نہ تھا۔ بچے بھی اس شادی پر بڑے خوش تھے اور جوئی کو زیادہ محبت سے جوئی آپا بلانے لگے تھے۔

پھر جوئی اور سلیمان لندن چلے گئے۔ ایک عرصہ تک پتہ نہ چلا کہ وہ کہاں ہیں۔ ایک روز آیا تو جوئی اُس کے ساتھ نہ تھی۔

''یہ میری بیوی ہے۔''

میں نے بیوی پر نظر ڈالی تو سواتی چادر میں ڈھکی ڈھکائی عورت جوئی نہ تھی۔

''یہ اطالوی لڑکی ہے..... مسلمان ہو گئی ہے اور یہ ہماری بچی ہے۔''

میں نے دل میں سوچا کہ سلیمان نے بھی مسلمان ہوتے ہی بیوی بدلنے کا ہی سوچا اور کوئی نیک کام نہ سوجھا۔ چھوٹی بچی سواتی لباس میں تھی۔ فراک نما کرتا نیچے دروازے والی چنت دار شلوار۔ سر پر سواتی ٹوپی۔ میں حیران کہ بیسویں صدی میں بغیر Pampers کے کسی بچے کا میں تصور بھی نہ کر سکتی تھی۔ یہاں شلوار میں اتنا بڑا شگاف تھا جس سے بچہ اپنی حاجات پوری کر لیتا اور گیلا بھی نہ ہوتا۔ اطالوی لڑکی نہ انگریزی جانتی تھی نہ اُردو۔ اس لیے اُسے بات کے لیے صرف خاں صاحب ہی میسر آئے۔ وہ دونوں اطالوی میں دیر تک باتیں کرتے رہتے۔ ایسے میں اینڈریوز ان کا منہ تکا کرتے لیکن کچھ سمجھ نہ پاتے۔

کچھ دن قیام کے بعد اینڈریوز صبح صبح بولا..... ''آج ہم واپس جا رہے ہیں۔ ٹماٹر کی فصل تیار ہو گئی ہے۔ نے چاچا حمید سے کہا تھا وہ خیال رکھتا ہو گا۔''

اس کے بعد سلیمان کب چلا گیا؟ میں اُس سے جوئی کے متعلق کچھ نہ پوچھ سکی۔ جوئی نے کیوں اُس سے نکاح کیا؟ یہ سوال ہی رہے کیونکہ میں جانتی تھی کہ کسی کا ہاتھ پکڑنا بھی اپنی ضرورت کے تحت ہوتا ہے اور اُس ہاتھ کو چھوڑنا بھی اپنی ہی جملہ خباثتوں کا نتیجہ ہوا کرتا ہے۔ کوئی شخص نہ کبھی کسی اور کے متعلق کچھ سوچتا ہے نہ اُس کو مدنظر رکھ کر فیصلے کرتا ہے لیکن میں نے اپنی لاتعلقی کی خباثت کا اظہار نہ کیا۔

سلیمان اور اُس کی اطالوی بیوی کے جانے کے بعد میں کاسنی کمرے میں گئی تو سارا کمرہ صاف تھا۔ فرش پھیری ہوئی، غسلخانہ دُھلا ہوا تھا۔

اس بار سلیمان ہم سے یوں رخصت ہوا جیسے امیر رشتہ داروں کے گھر سے دیہاتی غریب رشتہ دار رخصت ہوتے ہیں۔ اُس نے نہ ہمیں اپنا پتہ دیا نہ گرم جوشی سے الوداعی جملے ہی کہے۔ شاید اس نے بھانپ لیا تھا کہ یہ گھرانہ مغربی تہذیب کے نرغے میں آ گیا ہے۔ بچے انگریزی کتابیں پڑھتے ہیں۔ آپا جی اور خاں صاحب بھی اب مشرقی تہذیب کا شکار رہے۔ پتہ نہیں سلیمان کا آدرش ٹوٹ گیا تھا یا اُس نے ایک نئے معاشرے میں آزادانہ اپنا مقام پیدا کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ چھٹکارا حاصل کرنے داستان سرائے سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو جانے میں ہی عافیت سمجھتا ہو۔ وجہ جو بھی ہو سکتی ہے کے بعد سلیمان ہمارے ماضی کی داستانِ پارینہ بن گیا۔ اُسے صدا دیتے بھی تو بیکار تھا کیونکہ ماضی کبھی ملاقات کے لیے نہیں آ سکتا۔ اُسے دفن ہی کرنا پڑتا ہے۔ ایک دن میں نے اُس کا ذکر کیا تو خاں صاحب بولے..... ''جو شخص اپنے ماضی کی

ہے یا مستقبل کے اندیشے میں زندہ اُس کا حال بیکار ہو جاتا ہے۔"

زندگی نے ہمیں اور مصروفیات عطا کر دیں اور ہم ان دونوں کے قیام کو بھول گئے۔ ایک دن اچانک مجھے سوات سے ایک خط ملا۔ عجیب سی بات ہے لیٹر پیڈ داستان گو کا تھا لیکن لفافے پر مہر سوات کی تھی۔ خط میں رقم تھا کہ میں نے سوات میں زمین خرید لی ہے اور یہاں کاشتکاری کرتا ہوں۔ اس زمین کے عوض میں نے اپنی لندن کی زمین ان سواتیوں سے تبدیل کر لی ہے۔ ان کو لندن میں رہنے کا شوق ہے۔ میں یہاں اپنے آپ کو جنت میں محسوس کرتا ہوں۔ کئی سال میں نے پیشہ گری کی۔ نوجوانوں کو پڑھایا۔ مہذب لوگوں کو قریب سے دیکھا۔ اب میں پرندوں کی طرح معصوم لوگوں میں رہتا ہوں۔ مغربی تہذیب سے بہت دُور..... کھوتی پر اپنا سامان لاد کر منڈی لے جاتا ہوں (بہت دیر تک ہمیں سمجھ نہ آئی کہ یہ کھوتی کیا چیز ہے۔ پھر انیق بیٹے نے عقدہ حل کیا کہ خچر کو کہہ رہا ہے۔)

خاں صاحب انگریزی کی ڈکشنری پھرولنے میں مصروف تھے۔ نوکی نے خط لے کر پڑھا اور بولا:

"ابو! اینڈریوز کے پاس اب پندرہ گدھیاں ہیں جن پر وہ سامان لاد کر منڈی لے جاتا ہے۔"

ایک روز اینڈریوز اپنے ساتھ ایک سواتی لڑکی کو لے کر آ گیا۔ یہ خوبصورت لڑکی اُردو پنجابی سے بالکل ناواقف تھی۔ پڑھی لکھی ہونا تو درکنار وہ تو اشاروں کی زبان بھی نہ سمجھتی تھی۔ یہ اینڈریوز کی تیسری بیوی تھی۔

"میں نے سوات میں اس لڑکی سے نکاح پڑھوا لیا ہے..... یہ کھیتی باڑی کے ایسے گر جانتی ہے کہ مجھے وہاں کام کرنا مشکل نہیں رہا۔"

خاں صاحب نے حیران ہو کر کہا..... "بھائی! تم لوگ عجیب الخلقت ہو جو چاہتے ہو کر لیتے ہو۔ اپنی زندگی سے کھیلتے ہو۔ اس کے ساتھ ایسے ایسے تجربات کرنا تمہیں ڈر نہیں لگتا؟ وہ اطالوی بیگم کیا ہوئی؟"

"وہ مسلمان تو ضرور تھی۔ گاؤں میں نہیں رہ سکتی تھی چلی گئی۔ اُس کا کلچر اُسے گھسیٹ کر واپس اٹلی لے گیا۔"

ہوا یوں کہ لندن میں اینڈریوز کے پاس زمین تھی اور اُس کی سواتی بیوی کا باپ لندن امیگریشن کے چکر میں تھا۔ اینڈریوز پہلے تو اپنے سسر کی زمین میں کھیتی باڑی کرتا رہا پھر جب امیگریشن کے کاغذات مکمل ہو گئے تو اینڈریوز پندرہ گدھیوں اور سواتی زمین کا مالک ہو گیا۔ ان ہی گدھیوں پر سامان لاد کر منڈی لے جاتا ہے۔ سادی زندگی سے وابستہ ہے۔ ہمیں یہ بھی معلوم نہیں کہ اُس نے زندگی کے ساتھ تجربات کرنے بند کر دیے ہیں کہ ابھی تک یہ سلسلہ جاری ہے۔

جانے وہ سوات میں ہے کہ کہیں جاپان، ملیشیا یا کہیں چین میں رہتا ہے۔ اُس کی سواتی بیوی ساتھ ہے کہ لندن اپنے باپ کے پاس چلی گئی۔ لیکن نہ تو ہمارا تجسس اس قدر تیز بہدف ہے نہ ہماری دلچسپی ہی برقرار رہی۔ رابطہ ہو تو کیسے۔ اس کی چند نظمیں رہ گئی ہیں جو کبھی کبھی اُس کی یاد تازہ کرتی ہیں۔

اس خط میں ایک اور صفحے پر ایک نظم درج تھی اس کے نیچے 1975ء درج تھا۔ غالباً یہ نظم ہمارے پیڈ پر ہمارے گھر میں ہی لکھی گئی لیکن پوسٹ سوات سے ہوئی۔ لکھا تھا۔

بانو قدسیہ کے لیے ازلی شکریہ کے ساتھ!

جو حصہ آپ نے مجھے سلیمان ہونے میں ادا کیا اور دوسری مہربانیوں کے لیے (نیچے نظم تھی)

ایک مسلمان ملک میں ابھی تک میں بودھی مہاں پرشوں کی تلاش میں ہوں۔ مادہ سے بھری دنیا میں روحانیت ڈھونڈ رہا ہوں۔

میں دریا کنارے پیاسا ہوں.....سوپر مارکیٹ میں بھوکا کھڑا ہوں۔

چائے خانوں سے ''چائے'' کی صدا آتی ہے۔

''روٹی اور ترکاری''

مسجد سے اذان کی آواز اُٹھتی ہے ''اللہ ہو اکبر''

اللہ سب پر حاوی ہے

دنیا بے معنی ہے

اللہ کہو اور ان سب کو بے کار کھیل تماشے کے لیے چھوڑ دو

میری آنکھیں برسات خواب ہیں

محبت کی رسی پکڑ کر Illusion کے بادلوں سے گزر کر مجھے سات بلندیوں پر چڑھنا ہے

پہاڑ کی اُس سفید چوٹی پر پہنچنا ہے جہاں میرا آقا میری راہ دیکھتا ہے

وہ ہمیشہ ایک ہے

ہمیشہ تنہا ہے

میری محبت کے بغیر اداس ہے

میں اپنی منزل بھول گیا اور کھیل کود میں مصروف رہا

اے اللہ مجھے سکھا

اے نبی ﷺ مجھے یاد دلا

''اپنا کام چھوڑ اور نماز پڑھنے جا

ایک انعام تجھے آخرت میں ملے گا لیکن اطمینان قلب تجھے آج ہی نصیب ہو جائے گا''

سلیمان اینڈریوز

1975ء

اسی نظم کی پشت پر ایک اور نظم بھی درج ہے۔ یہ نظم اینڈریوز نے 1967ء میں لکھی تھی جب وہ ابھی مسلمان نہیں ہوا تھا اور اپنی پریشانی کی بند گلی سے نکلنا چاہتا تھا۔

''بند انجام''

وہ اُس شخص کو اختتام تک پہنچ چکا تھا

اُس گلی کے آخر تک

اُس پاپ سانگ کے انجام کو
اپنے خیالات کے ایسے لمبے سلسلے
جنہوں نے اُس کی زندگی کے مضافات کو
سہ پہروں تک ڈھانپ لیا تھا
اُسے اپنے کمرے سے کیوں اتنی نفرت تھی؟
اسی مسئلے کو سب سوچوں نے گھیرے میں لے لیا
پھر اُس نے سب کچھ ڈھیلا چھوڑ دیا
ہر شے کو زمین پر بکھرنے دیا
وہ فرش پر ٹھنڈا لیٹا سگریٹ پیتا رہا
دیوار پر بارش اور سورج پھسلتے رہے
اور وہ کھلی آنکھوں انہیں دیکھتا رہا
وہ تذبذب تھا.....
شاید دیر ہو چکی تھی
اور اس دیر کے اصل میں کیا معنی تھے
وہ ہر شے کے معنی کھو چکا ہے
تذبذب ہے کہ کیا کبھی کوئی چیز بامعنی بھی تھی
وہ اپنے آپ کو ایک ٹھنڈا ستارہ سمجھتا ہے
جس نے اپنی مروّت میں سورج کو جنم دے رکھا ہے
وہ آرزومند ہے کہ کسی دن ہر امید ختم ہو جائے
پھر وہ پارک میں کھلی دھوپ میں اُگتا رہے گا
گھاس کے لاکھوں beds میں ایک تنکا
جیسے صبح کے وقت گھاس کاٹنے والی مشین کا بلیڈ
کاٹ کر دھر دے
وہ سبزے کے فوارے میں تیرتا رہے گا
اُسے شدید آرزو ہے کہ
یا تو اُسے پروا ہو یا وہ بے نیاز ہو جائے
وہ جاننا چاہتا ہے کہ کیا وہ مر رہا ہے
یا زندہ ہے

یا کیا؟

اینڈریوز

1967

اینڈریوز کی نظم پڑھ کر ہم دونوں دیر تک چپ رہے۔ یوں لگا جیسے ایک مدت بعد کوئی گمشدہ انگوٹھی ملی ہیرا گر چکا تھا۔ خاں صاحب نے بالآخر بڑی جرأت سے کہا ''زیادہ مت سوچو قدسیہ! بڑے سے بڑا ادیب بھی کہانی نہیں بن سکتا۔ سلیمان بھی ایک ایسی ہی کتھا ہے جس کی نہ کوئی ابتدا ہے نہ انتہا..... بس وہ یہیں سے نکلتا ہے کہیں ختم ہو جاتا ہے۔ جو کچھ ہوتا ہے ہونے دو..... جو نہیں ہو سکتا اُس کی آرزو میں اپنا آپ بھسم نہ کرو۔ آرزو کے بھاگنے والا چاہے مجنوں ہو..... چاہے کوئی سائنس دان کوئی صوفی ہو یا شریعت کا پابند..... آرزو کے تعاقب میں درست نہیں۔ اس کے لیے شانتی کا آسن لگا کر انتظار کرنا پڑتا ہے۔ دیکھنا پڑتا ہے کہ آخر اُس وحدہ لاشریک کی ہے..... کیوں ہے نہیں..... بلکہ کیا ہے..... یہی بڑا راز ہے۔''

سفر (اوسلو)

سن 1982ء میں Loriters Ilsion Oslo نے مجھے اور خاں صاحب کو اوسلو مدعو کیا۔ ناروے خوبصورت شہر کی عمارتیں گویا آئینہ خانہ تھیں۔ سڑکیں دُھلی دُھلائی' لوگ شائستہ سفید اور نرم طبیعت تھے۔ تھسین سے ملاقات ہوئی جنہوں نے قرآن کریم کا ترجمہ ناروئیجین زبان میں کیا تھا۔

بہت سے ادیبوں سے بھی واقفیت ہوئی لیکن زبان آڑے آئی لیکن Helge Vatsend کو ہم اپنی پٹاری میں ساتھ لے آئے۔ اس سے Trolls کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے دوران ہمیں پتہ چلا کہ وہ شاعر اُس کی کچھ نظمیں انگریزی میں ترجمہ بھی ہو چکی ہیں۔ ناروے کے لوک رُوپ میں Trolls بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔

Trolls ایک نوعیت کی دیومالائی مخلوق ہیں جیسے جن اور پری کا تصور ہمارے ادب اور لوک کہانیوں ہے۔ ان ٹرولز کا کام انسانوں کی مدد کرنا اور مشکل وقت میں اشارے کنائے سے انتباہ کرنا ہے۔

قریباً سال کے بعد ہیلگے ویٹ سینڈ کا خط ملا۔ اُس کی چند نظمیں بھی ملفوف تھیں جو آپ کو سنائے دیتے ہیں

(انگریزی ترجمہ Olav Grinde نے کیا ہے)

(1)

''چیتل''

ہر روز تکنیک (Perfect) ہوتی جاتی ہے

ہمارے لونگ روم میں اب شو ہوتا ہے

دنیا کے ریکارڈ

نیاگرا کی گھن گرج
گھاس کے blades پر کیڑے مکوڑوں کی زندگی
بے رحمی کی حد تک بے نقاب
لیکن خوبصورت رنگوں میں موجود
لیکن ایسے دن بھی آتے ہیں
جب ٹی وی کے رنگ گرے ہو جاتے ہیں
جس طرح خزاں کی بارشیں مناظر دُھندلا دیتی ہیں
اور چہرے دُھندلا دیتے ہیں
لیکن جلد ہی دوسرے پروگرام ان کی جگہ آ جائیں گے
چینل کا سوئچ کل کی آزادی کا سمبل ہے
جھنڈا اور ہتھیار ہے
ہم پھر بور نہیں ہوں گے
پھر ہم سڑکوں پر اکٹھے ہو کر
بے صبری سے تبدیلی کے نعرے نہیں لگائیں گے
دنیا کی تصویر پر ہمارے لیے اور بھی perfect ہو جائے گی
ہماری زندگی سے حیات کا رس
لمحہ بہ لمحہ پہر در پہر چوستی ہوئی

(2)

Light Rope Art (ایک جھلکی)
شعبدہ باز اُونچا آسمان میں چڑھا
مسکراتا ہے
وہ تنی ہوئی سرکس کی رسی پر تنہا ہے
جانتا ہے کہ اگر وہ گر پڑا
تو پھر سب کچھ ختم ہے
کیونکہ سکرین پر صرف Perfection دکھائی جاتی ہے
ہم Sirens بجاتے چیختے
اُس کے گرنے کا انتظار کرتے ہیں

ریل کاریں اپنے راستوں سے گر کر الٹتی ہیں
ڈرائیوروں کی گردنیں ٹوٹ جاتی ہیں
سیلابی لہریں
بموں سے مسمار گھر
ہمارے عہد کی تباہیاں
آج کے نو وارد وقت

لیکن ہمیشہ وہی چہرے دیکھنے کو ملتے ہیں
وہی الفاظ
اُن لوگوں کے منہ سے جو ٹیلی ویژن کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں
الفاظ تصویریں
متوازن آراء
رسی پر چلنے والا شعبدہ باز مسکراتا ہے
صرف ہم ہی شکوک کے ساتھ رہتے ہیں

(3)

(ناگفتنی) The Unspeakable. Translated by Olav Grinde

جانِ من ایک خاردار لمبے راستے پر پہنچ کر
ایک ایسے ناگفتنی مقام پر پہنچنا
جہاں الفاظ کی اشد ضرورت ہو
ہم اُس متن میں
اپنی خالی جگہیں بنا لیتے ہیں
جہاں صرف خاموشی ہوا کرتی ہے
ایک ایسی چپ جسے دانش کہا جا سکتا ہے
گھنٹی کی طرح خالی
باہر اندھیرے میں گھاس کے blade جیسی
مسل ٹو کے نیچے دیے گئے بوسہ کی مانند
ایک مکمل بات

ہمیں پرانی دانش سے بھری کہاوتیں
اپنی خاموشی پر چھائی لگتی ہیں
جو ایک بلی کی طرح
اپنے نرم پنجوں پر
دائروں میں چلتی ہے

(4)

(Silence) سناٹا
کچھ بھی تو نہیں ہوتا
دن آہستہ آہستہ گزرتے ہیں
شام کے وقت
تھکے ہارے رپورٹر کی طرح گھر لوٹتے ہیں
چیختے، چلاتے، آگے بڑھتے
تعاقب میں تیز تیز
منتظر
ایسے شگون کے لیے
جیسے آسمان میں بادل
ہوا میں Tension ہے
اور جسم خارش سے بھر گیا ہے
آنے والا کل
دھرتی کے سخت سینے
ہل چلانے آئے گا
ایسا ہل جو ہمارے ہل سے بھاری ہوگا
ہم منتظر رہتے ہیں
ہماری پریشانی معکوس ہو
ہماری روح میں گھس بیٹھتی ہے
ایک دن یہ خاموشی
ہمارے کان کے پردے پھاڑ دے گی

سفید موت
خاموشی کی سفید موت
برف زمین سے ڈھانپ دی جائے گی
اور اُس پر لہو ہوگا

(5)

Game (کھیل)
سکہ مشین میں ڈالا جاتا ہے
Pin Ball مشین کی ساری حرکتیں مشینی ہیں
میرے متحرک جذبات اس کے حریف ہیں
فتح مندی، دولت، آزادی
ایسے الفاظ سے میرے خواب اور اُمیدیں وابستہ ہیں
ایک دن ایسا لمحہ ضرور آئے گا
ایسا لمحہ شگاف
جب پہیے ٹھیک بیٹھ جائیں گے
جس طرح کوئی نظم اچانک دل کو ہلا دیتی ہے۔

یہ نظمیں غالباً ستر کی دہائی میں لکھی گئیں اور مجھ تک 1983ء تک پہنچیں۔ یورپ کے یہ لوگ مشینی زندگی کی برکات اور اس سے پیدا ہونے والی تنہائی سے دنیا میں سب سے پہلے آشنا ہوئے۔ ان کی برف پر انسانی لہو کی قتل سے نہیں بلکہ انسان کی آئیڈیلز کی ٹوٹ پھوٹ سے بہہ نکلیں۔

میں نے یہ نظمیں اس لیے گوش گزار کی ہیں کہ ابھی ہم نے Perfection کی دوڑ میں حصہ نہیں لیا تھا۔ اکثریت ٹیلی ویژن کے آگے بیٹھ کر کار ریس، سونامی کے سیلاب، زمانے بھر کے اشتہار نہیں دیکھتے تھے۔ ہمارے بچے سکہ ڈال کر جوا کھیلنا نہیں سیکھا تھا۔ ہم ابھی دیہات کے سوئے ہوئے کلچر، اس کی جہالت، رسم و رواج، مذہب اور اس سے حاصل شدہ سکون سے آشنا تھے۔

جس کیفیت سے گزر کر یورپین ادب اور ہیلگے جیسے نامعروف شاعر کی نظمیں وجود میں آئیں یہ بیسویں صدی کے آغاز میں یا اس سے کچھ ہی دیر پہلے ملا۔ مشرق کی سخت زمین میں ہل چل رہا تھا۔ تبدیلی آ رہی تھی لیکن ابھی ہمیں شعوری طور پر اس کا کلی احساس نہ تھا۔

آخری ایام

(گھر کو واپسی)

کچھ تو خاں صاحب کی بیماری نے کمر توڑ دی تھی کچھ نفسیاتی، قلبی، ذہنی طور پر میں خوف سے تتری تتری ہو گئی تھی۔ ایک خوش الحان، راست گو ساتھی سے بچھڑنے کا برا خواب ہر وقت ساتھ تھا، جسے میں مگس راں سے اُڑاتی رہتی تھی، یہ خواب درماندہ پیچھا چھوڑتا تھا نہ ہوئی ٹلتی ہی نظر آتی تھی۔

چھ ستمبر کی رات عجیب بے کسی سے پا پیادہ چل رہی ہے۔ خاں صاحب کی ڈوبتی نبض اتنی دھیمی تھی کہ بار بار شبہ ہوتا کہ ہے بھی ابھی نہیں ہے۔ سرخ و سپید چہرہ جس تکیے پر دھرا تھا اُسی کی مانند سفید ہو چکا تھا۔ بازوؤں کا گوشت جھالر صفت لٹک رہا تھا۔ نہ بالوں میں آب و تاب باقی تھی نہ داڑھی میں چمک تھی۔ درد مسلسل چھاپے مار رہا تھا، لیکن اُن کی آواز میں بے بسی، ناشکیبائی یا رتی بھر شکایتی لہجہ در نہ آیا تھا۔

وہ بار بار اُٹھتے مجھے بلاتے۔ میں اُٹھتی پاس جاتی وہ کمزور مدہم آواز میں کہتے ''میں نے تمہیں بہت تنگ کر رکھا ہے۔'' میں جواب میں کچھ نہ کہہ پاتی۔ کچھ دیر میں اُن کا ہاتھ پکڑ کر بیٹھتی۔ پھر وہ بڑے تردد کے ساتھ مجھے کہتے ''سو جاؤ اور میرے بلانے پر بھی نہ اُٹھنا۔''

اُن کی تکلیف اس قدر زیادہ تھی کہ اندر ہی اندر یہ دُکھ مجھے ستا رہا تھا کہ کاش وہ قوت برداشت کا مظاہرہ کرنے کے بجائے روئیں چلائیں، واویلا مچائیں۔ لیکن خاموش شیر قالین تو صاحب فراش تھا۔ ہم دونوں جاگ رہے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کو سُلانے کا مشغلہ اپنائے ہوئے تھے۔

رات قطرہ قطرہ گزر رہی تھی جیسے ڈرپ میں لگا خون۔

کمرے میں ایئر کنڈیشنر کی آواز چہرے پر منڈلانے والی مکھی کی طرح بھنبھنا رہی تھی۔ کمرے میں لگا کلاک نحوست پھیلانے کے انداز میں سیکنڈ کی سوئی بجائے جا رہا تھا۔ آج اس کی آواز گویا کوچ کا نغمہ تھا۔

کمرے میں زیرو کا بلب روشن تھا، جس کی روشنی پر یاس کا پیلا پن نمایاں تھا۔

کتابوں سے لدی الماریاں جامد، باسی اور پرانے کاغذوں کی بو باس کمرے میں پسرے کر رہی تھیں۔ پتہ نہیں کیوں میری آنکھوں کو دھوکا ہو رہا تھا کہ تمام خاکستری کتابیں زرد رنگ کی ہو چکی ہیں اور اُن پر ہوائیاں اُڑ رہی ہیں۔ کتابوں کے عنوانات جو خاں صاحب کی لکھائی میں کتابوں کے پشتوں پر لکھے پڑھے نہ جاتے تھے۔

اُبھرنے والی صبح بچھڑنے والی رات سے گلے مل رہی تھی۔ گویا کسی مستقل دچھوڑے سے خوفزدہ ہو کر آپس سے بھیگ گئی ہو۔

قریباً چار بجے تھے جب اُنہوں نے مجھے بلایا۔

''سنو انیس خاں کو فون کر دو..... وہ آ جائے۔''

میں نے پُر امید ہونے کے انداز میں غلط جواب دیا..... ''آپ فکر نہ کریں خاں صاحب! ابھی صبح ہونے والی ہے۔ وہ خواہ مخواہ پریشان ہو جائے گا۔''

''اچھا۔'' اُنہوں نے اپنی کربل کربل کرتی پریشانی کو برداشت کے پتھر تلے دبا لیا۔

پھر چھ بجے کے قریب اُنہوں نے آواز دی ''بانو..... ہو گئیں؟''

میں جان بوجھ کر آنکھیں ملتی اُٹھی ''جی خاں جی!''

''یہ ذرا میری نبض دیکھنا۔''

وہ بدھا روپی چہرہ لیے لیٹے تھے۔ چہرے پر رتی بھر پریشانی نہ تھی۔ گردنیم باز کا قرض چکانے کی اطمینان کی صورت۔

میں نے نبض محسوس کرنے کی کوشش جاری رکھی..... اُنہوں نے بھی اپنے ایک ہاتھ سے دوسری کلائی کو پکڑے دونوں چپ رہے۔

پھر میں نے ہائی ٹون کے ڈاکٹر عاطف کے موبائل کا نمبر ملایا اور اُٹھ کر غسلخانے میں چلی گئی۔ میں نہیں تھی کہ وہ میری آواز سے کچھ اندازے لگائیں۔

''عاطف! پلیز آپ آ جائیں۔ خاں صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں۔''

''کیا ہوا؟''

''بس جی نبض بہت آہستہ چل رہی ہے اور.....''

''آپ فوراً ڈرپ لگوائیں۔''

''اچھا جی..... آپ آ جاتے اگر تو تسلی ہو جاتی۔''

''میں ضرور آ جاتا لیکن اس وقت میں ایئرپورٹ جا رہا ہوں۔''

میں واپس کمرے میں آ گئی۔

''عاطف کو بلایا؟'' اُن کی آواز میں کوئی جھگڑا نہ تھا۔

''وہ ایئرپورٹ جا رہے ہیں..... اسلام آباد..... میں اثیر بیٹے کو جگا لاؤں؟''

"ناں ناں..... پہلے وہ رات ایک بجے تک بیٹھا رہا ہے۔ بینکر کی نیند خراب نہیں ہونی چاہئے۔ بڑی ذمہ داری کا ہے۔"

"انیس کو فون کروں؟"

"ناں ناں..... تم بھی سو جاؤ۔ اب میں ٹھیک ہوں۔"

خاں صاحب نے مسکرانے کی کوشش میں ہونٹ ٹیڑھے کر لئے۔

میں ڈاکٹر عاطف گوہیر کو فون ملانے میں مصروف ہو گئی۔ سائرہ ہسپتال والے ڈاکٹر گوہیر.....

وہ غالباً موبائل ہاتھ میں لیے بیٹھے تھے۔

"ڈاکٹر صاحب! خاں صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں....." میں چپ ہو گئی۔

"ابھی ڈرپ لگا دیں گے ٹھیک ہو جائے گی۔"

مجھے یوں لگا گویا وہ پہلے سے ہسپتال کی ایمبولینس میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ابھی میں سوچ بھی نہ پائی تھی کہ کیا کرنا ہے۔ کیا ہونا درکار ہے کہ ڈاکٹر گوہیر آن پہنچے۔ ہم قریباً دس منٹ میں باہر آ گئے۔ پہلے ڈاکٹر صاحب نے شفقت جی کو ایمبولینس میں سوار کرنا چاہا پھر کچھ سوچ کر بولے انہیں میری کار میں بٹھا دیجئے۔

اس وقت جب ہم انہیں کرسی سے فرنٹ سیٹ پر منتقل کر رہے تھے۔ اثیر خاں بیٹھنے کے لیے تیار ہو کر آ گئے۔

"میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں ابو....."

بابا جی

(از ڈاکٹر عاطف گوہیر)

صبح سات بجکر پچیس منٹ پر بانو آپا کی مخصوص سکون آمیز آواز میرے کانوں میں پڑی۔ "ڈاکٹر صاحب تکلیف کی معافی۔ خاں صاحب کی طبیعت چار بجے سے کچھ ٹھیک نہیں۔ ٹھنڈے پسینے آ رہے ہیں اور کسی کروٹ آرام نہیں۔" میں نے پچھلے چھ ماہ کے اس کٹھن امتحان سے گزرتے ہوئے کم ہی کبھی بانو آپا کو پریشان دیکھا تھا۔ اس خاں پسند شفقت و ممتا کی بارعب دیوی کو جو سفید لباس اور سفید کھلے دوپٹہ میں اپنے آپ کو لپیٹے رکھتی جب خاں صاحب کے بارے میں زیادہ تشویش ہوتی تو وہ پنجابی کے بجائے اردو میں اس کا اظہار کرتیں۔ اس دن آپ کی اردو سن کر میرا دل ایک ہارٹ بیٹ مس کر گیا۔ خیال آیا کہ اشفاق احمد صاحب جو پچھلے تقریباً چھ ماہ سے انتہائی تکلیف دہ بیماری کا مقابلہ مرحلہ وار احسن طریق پر کر رہے تھے۔ شاید آج اس دنیا میں اپنا آخری فرض بھی عالمانہ تحمل اور صوفیانہ بے نیازی سے سرانجام دینے لگے ہیں۔

آغا جی کا قول ہے کہ دل میں جو پہلا خیال آتا ہے وہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی جانب سے ہوتا ہے۔ میں نے اس سوچ کو ذہن سے نکالنے کی کوشش کی اور ایک بار پھر اللہ سبحانہ تعالیٰ سے دعا کی کہ وہ اشفاق صاحب کو آسانیاں عطا فرمائے۔

یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اشفاق صاحب سے میری ملاقات صدیوں پہلے ہوئی تھی۔ یادداشت کو کرید
بھی بچپنے میں ریڈیو پر تلقین شاہ کا یکتا انداز اور ہر دلعزیز مثبت مزاحیہ بیان اُبھرتا ہے جسے میں بڑے شوق سے اپنے
کے ساتھ بیٹھ کر سنتا تھا۔ اس زمانے میں آپ کی سبق آموز باتیں تو سمجھ میں کم آتی تھیں مگر ہلکی پھلکی خوش باش
ضرور لطف اندوز ہوتا تھا۔ پھر تقریباً سات سال پہلے سائرہ ٹرسٹ ہسپتال کی ایک تقریب میں آپ سے بالمشافہ
ہوئی اور آپ بہت بھلے لگے۔ اس وقت آپ بلاشک وشبہ اپنے منفرد انداز بیان اور صوفیانہ گفتگو کی وجہ سے
ایک جداگانہ عالی وقابل رشک مقام بنا چکے تھے۔ آپ کی ٹکر کا کوئی استاد اور عالم جو بات کو کہانی کا رنگ دے کر
انداز میں کسی بھی محفل میں نہایت طمانیت سے ذہن نشین کرا سکے اور سمجھا سکے کم ہی کوئی نظر آتا تھا بلکہ آج بھی
آتا۔ آپ ترقی پسند تھے اور زمانہ شناس تھے۔ اولیاء اللہ اور علماء میں ایک واضح فرق یہ ہے کہ اولیائے کرام زمانے
نبض پہچانتے ہیں اور حاضرین اور معتقدین کی ذہنی قابلیت کو سامنے رکھتے ہوئے بات سمجھاتے ہیں۔ دوسری طرف
اکثر زمانے سے ناآشنا اپنے علم کی بھاری بھرکم سلوں کو دوسری کے سروں پر دھونستے ہوئے فرعونی اہرام مصر تعمیر کر
چکر میں رہتے ہیں۔

بانو آپا سے فون پر بات کرنے کے بعد میں نے سوچا کہ بہتر یہی ہوگا کہ خود چل کر اشفاق صاحب کی
کر آؤں۔ پھر خیال آیا کہ بیگم کو بھی ساتھ لے چلوں کہ اگر ان کی طبیعت زیادہ خراب ہوئی تو وہ بانو آپا کا ساتھ دے
آٹھ بجے سے کچھ پہلے داستان سرائے پہنچے۔ مجھی خدمت گزار جواں سال ریاض ہمیں جلدی سے اشفاق صاحب
کمرے میں لے گیا۔ میں نے اس مجھی خدمت گزار اور اس کے بھائی اعجاز کو ہمیشہ فرض شناس چابک دستی سے
صاحب کی خدمت کرتے دیکھا۔ اشفاق صاحب ہمیشہ انہیں بیٹا یا پتر کہتے اور وہ انہیں ابو۔ ویسے بھی جس گھر کا
ایک منجھا خدا ترس صوفی عالم ابو ہو اور جس گھر کی مالکن ایک درویش صفت عجز وانکساری کی پیکر آپا ہو تو اس سرائے
والا ہر جماد ونبات اور ذی روح کھلی بانہوں اور بے شکن جبیں سے اپنے آرام کو پس پشت ڈال کر دوسرے کے آرام
سوچے گا اور اس دنیادار فقیر کے تو انداز ہی نرالے تھے۔ میں نے کبھی نہ دیکھا کہ آنے والے کی آؤ بھگت ایسے
ہو جیسے وہ ہی خاص الخاص ہے۔ رنگ برنگے مشروبات، میٹھے لذیذ پکوان اور رسیلے موسمی پھلوں سے لدی پھندی
کے ساتھ ساتھ کمرے میں آموجود ہوتی۔ قسم قسم کی جڑی بوٹیوں سے بنے ہشاش بشاش کر دینے والے قہوے
سرائے کا خاصہ ہیں۔

لبلبہ کے جاں لیوا کینسر نے اشفاق صاحب کے منہ کا ذائقہ بدل کے رکھ دیا تھا۔ ابتدائے مرض میں
تو لگتی تھی مگر کھانا بمشکل نیچے اُترتا تھا۔ آخری ایام میں تو بھوک بھی مرگئی تھی اور جسم آدھا رہ گیا تھا۔ ایک روز میں
وقت گیا تو نہا دھو کر صاف شفاف لباس زیب تن کیے لیٹے تھے۔ فرمانے لگے آج میں نے نہانے کے بعد اپنے
دیکھا تو یہ تو بہت چھوٹا چھوٹا سا رہ گیا ہے۔ آپ کی خوش خوراکی دیدنی تھی۔ نہایت انہماک سے دیسی مرغی کے شوربے
گرما گرم روٹی کے لقمے ڈبو ڈبو کر آپ کو کھاتے دیکھ کر میں خوب محظوظ ہوا کرتا تھا۔ مگر اب آپ کا گزارہ بمشکل دودھ
اور دودھ دہی اور شربت پر تھا۔

اس انتہا درجے کی جسمانی کمزوری کے باوجود آپ کا ذہن آخری لمحے تک چاق و چوبند رہا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ آپ کی دلچسپ، مفصل اور پُر مقصد تمہید باقی نہ رہی۔ اب آپ چند جامع اور کھرے جملوں میں بڑے بڑے پیچیدہ مسائل بتا دیتے تھے۔ وصال سے آٹھ دس روز پہلے میں نے اس بوستانِ علم و ہدایت سے جب دریافت کیا کہ کیا اقبال کا فلسفہ خودی تصوف کے فلسفۂ بے خودی سے ہم آہنگ ہے۔ تو فرمایا ''بیٹا! اصل میں اقبال کی خودی وحدت الوجود والی بات ہے۔''

سلسلۂ شفا سے متعلق کئی ڈاکٹر، حکیم، ہومیو پیتھ، جوگی، غائب اور فنکار اس عالم صوفی کے درد کا کچھ مداوا کرنے پہنچے۔ صدی سے کچھ اوپر الفت و محبت کے اس مینار کی شگفتہ تحریر اور گفتگو کا اثر تو انہوں نے شاید بہت زیادہ نہ لیا تھا مگر وہ ضرور دھنتے رہے تھے۔ آپ کو اور بانو آپا کو خوب علم تھا کہ شفا ان نعمتوں میں سے ایک ہے جو اللہ تعالیٰ خود بانٹتا ہے۔ کبھی اونچے اونچے دمکتے چمکتے صنعتی ہسپتالوں کے سوداگروں کے ذریعے اور کبھی کسی طبیب کی دقیانوسی بے دام میں پائی جاتی ہے۔

آپ پیدائشی طالب علم تھے۔ خوب جانتے تھے کہ اصل علم ہمیشہ طالب علم رہتا ہے۔ وصال سے تقریباً سال پہلے آپ کی ملاقات سلسلہ نقشبندیہ کے روحانی پیشوا آغا جی سے ہوئی۔ دونوں کی یہ کوشش رہتی کہ وہ دوسرے کو ہی سننے دیں۔ ایک دن تو اشفاق صاحب کہہ ہی اٹھے ''آغا جی! لوگ میری باتیں سننے آتے ہیں لیکن میرا دل چاہتا ہے جب آپ تشریف لائیں تو میں چپ ہو کر آپ کی باتیں سنتا رہوں۔'' ہم وہ خوش قسمت ہیں جنہوں نے کئی بار ان علم اور نفع بخش محفلوں کے مزے لوٹے۔

تشخیص مرض اور ایک پیچیدہ اور میجر سرجری کے کٹھن مرحلے سے گزرنے کے بعد ایک دن آغا جی اشفاق صاحب سے فرمانے لگے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی لامحدود حکمت میں انسان کی بنیادی ضروریات انسان کو فری مہیا کر رکھی ہیں۔ آکسیجن کے لیے انسان کو کسی کا دروازہ کھٹکھٹانا نہیں پڑتا۔ یہ بازاروں میں فروخت نہیں ہوتی۔ اسی طرح ہدایت اللہ دیتا ہے، جب چاہتا ہے فری مہیا کر دیتا ہے۔ یہ مہنگے داموں مہنگی مہنگی درسگاہوں سے خریدی نہیں جا سکتی اور یہی حال علم کا ہے۔ اللہ یہ نعمت بھی خود بانٹتا ہے۔ یہ جنس تجارت نہیں۔ اشفاق صاحب چہک اٹھے اور ماتھے پر ہاتھ مار کر فرمایا ''یہ وحدت الوجود والی بات تو مجھے پتا تھی مگر یہ ہدایت اور شفا والی بات اب سمجھ میں آئی۔''

آپ منہ کا ذائقہ بحال کرنے کے واسطے جوارش کمونی اور جوارش تمر ہندی کا استعمال کرتے۔ درد کو دور کرنے کے لیے ہومیو پیتھی اور ایلو پیتھی کی ملی جلی گولیاں لیتے۔ حب طلائی کا استعمال بھی خوب کیا کہ یہ مقوی قلب ہے اور آغا جی کی دی ہوئی ان گولیوں کی خوب حفاظت کرتے۔ یہ مسور کے دانوں سے آدھی بلکہ اس سے بھی کہیں چھوٹی گولیاں تھیں جن کی عمر آٹھ ماہ سے اوپر کا عرصہ درکار ہوتا ہے۔ آپ انہیں شرارت سے پھدکتی بے قرار گولیاں کہہ کر یاد کرتے۔ جسمانی کمزوری آپ کو بہت زچ کیے دیتی تھی مگر میں نے آپ کو کبھی گھبرایا ہوا نہ پایا۔ تقویت حاصل کرنے کے لیے آپ باقاعدگی سے ٹیکے لیتے اور کئی بار ہم انہیں طاقت و توانائی کی ڈرپ دیتے۔ آپ سب معالجین کے مشورے بغور سنتے اور پھر اپنی طبیعت، مزاج اور ضرورت کو سامنے رکھتے ہوئے فیصلہ کرتے۔ مگر جب فیصلہ کر لیتے تو اس پر کاربند رہتے۔